بلوچی افسانوں کے اردو تراجم: آغاز وارتقا

فضل کریم*

دنیا کی دیگر زبانوں کی طرح بلوچی میں بھی ترجمہ نگاری کی ایک روایت موجود ہے جس کی ابتداء اُنیسویں صدی کے آخر میں ڈھاڈر کے مقام پر اس وقت ہوئی جب "مکتبہ درخانی" کے پلیٹ فارم پر مولانا فاضل درخانیؒ اور مولانا حضور بخش جتوئی نے اپنے رفقائے کار کے ساتھ مل کر عیسائی مبلغین کی بلوچستان آمد اور عیسائیت کی تبلیغ کے ردِ عمل میں قرآن مجید اور دیگر مذہبی کتب کو بلوچی اور براہوی زبان میں ترجمہ کرکے اسلامی تعلیمات کی تشریح اور تفہیم نو کی۔

انیسویں صدی کے آخر اور بیسویں صدی کے اول میں برصغیر پاک وہند کے دوسرے خطوں کی طرح بلوچستان بھی عیسائی مبلغین کی تبلیغی سرگرمیوں کا مرکز بن چکا تھا۔ انھوں نے اس خطے کے لوگوں کو مختلف حیلوں اور بہانوں سے عیسائیت کی طرف راغب کرنے کی بھرپور کوشش کی اور اپنے اِس مشن کو پایۂ تکمیل تک پہنچانے کے لیے انھوں نے بائبل کے بلوچی اور براہوی زبان میں ترجمے بھی کیے تاکہ وہ بہتر اور موثر انداز میں عیسائیت کی تبلیغ کر سکیں:

> انیسویں صدی کے اواخر میں جب انگریزوں کے قدم برعظیم میں جم چکے تھے اور سیاسی واقتصادی تسلط کے ساتھ ساتھ مذہبی اثرات بڑھانے کے لیے عیسائی مشنریاں سرگرم عمل تھے یہاں تک کہ ۱۹۰۷ میں انجیل مقدس (باب یوحنا) براہوی زبان میں شائع کر دی گئی۔[1]

عیسائیت کے اِس یلغار کو روکنے اور اس خطے کے لوگوں کی اسلامی تشخص کو محفوظ بنانے کے لیے مولانا حضور بخش جتوئی اور فاضل درخانی جیسے جیّد علمائے دین سامنے آئے اور ۱۸۷۶ میں انھوں نے ڈھاڈر کے مقام پر "مکتبہ درخانی" کے نام سے ایک ادارہ قائم کیا اور اسی ادارے کے تحت انھوں نے قرآن مجید سمیت دیگر اسلامی کتب کا بلوچی اور براہوی زبان میں ترجمہ کرکے عیسائیت کی تبلیغ کا جواب دینے کی سعی کی۔

"مکتبہ درخانی" کا سارا سرمایہ مذہبی تراجم پر مشتمل ہے۔ چوں کہ اِس ادارے کے قیام کا بنیادی مقصد خالصتاً مذہبی تھا اِسی لیے اس سے وابستہ تمام مصنفین و مترجمین نے صرف مذہبی افکار کو مقامی زبانوں کا جامہ پہنایا اور انھوں نے ادبی ترجمہ نگاری کی طرف کوئی توجہ نہیں کی۔ اس کی دوسری وجہ یہ بھی ہو سکتی ہے کہ اس وقت بلوچی

* اسسٹنٹ پروفیسر، گورنمنٹ عطاشاد ڈگری کالج تربت، بلوچستان

زبان میں تحریری ادب کا آغاز نہیں ہوا تھا۔ بلوچی ادب کا کل سرمایہ کلاسیکی شاعری اور لوک کہانیوں پر مشتمل تھا جن کو ابھی تحریری شکل میں پیش کرنے کا کام باقی تھا چناں چہ اس ادارے سے وابستہ مترجمین نے ادبی تراجم کی بجائے مذہبی ترجمہ نگاری پر اپنا وقت اور وسائل صَرف کیے۔

قران مجید کے علاوہ جن مذہبی کتب کا بلوچی زبان میں ترجمہ کیا گیا اِن میں درسِ قدوری، شمائل شریف، صد پند لقمان، روضته الحساب، اور حکایت الصادقین قابلِ ذکر ہیں۔

مکتبہ درخانی کے قیام سے لے کر اگلے نصف صدی کے زائد عرصے تک بلوچی زبان میں ترجمہ نگاری میں ایک وقفہ آیا۔ تراجم کا دوسرا دور ۱۹۵۰ کی دہائی میں اس وقت شروع ہوا جب مولانا خیر محمد ندوی نے کراچی سے ایک ماہ نامہ رسالہ اومان کا اجرا کیا۔ اس رسالے نے پہلی مرتبہ بلوچی ادب کو جدید اصناف کے ساتھ ساتھ جدید شعری ونثری رجحانات سے روشناس کرایا۔ بلوچی کا پہلا افسانہ اومان ہی میں شائع ہوا۔ اس کے بعد آنے والے مختلف شماروں میں افسانے شائع ہوتے رہے۔ طبع زاد افسانوں کے ساتھ ساتھ افسانوی تراجم کو بھی متعارف کرانے کا سہرا ماہ نامہ اومان کے سر جاتا ہے۔ مارچ ۱۹۵۲ کے شمارے میں ع۔ص امیری نے میکسم گورکی کے افسانے "The Remorsed Woman" کو "پشومانیں جنین" کے عنوان سے ترجمہ کیا۔ یہ کسی بھی زبان سے اولین بلوچی ترجمہ ہے۔

> بلوچی زبان میں افسانوی ادب کے ترجمے کی روایت ماہ نامہ اومان سے شروع ہوتی ہے اور اس ضمن میں ع۔ص۔امیری وہ پہلے شخص ہیں جنھوں نے میکسم گورکی کے افسانے The Remorsed Women کو بلوچی کا روپ دیا۔ یہ افسانہ مارچ ۱۹۵۲ میں ماہ نامہ اومان میں شائع ہوا۔[۲]

بلوچی افسانے کے اس ابتدائی دور میں ترجمے کی رفتار بہت سست ہے اس کی سب سے بڑی وجہ رسائل وجرائد کا فقدان ہے۔ اِس ابتدائی دور میں صرف ماہ نامہ اومان ماہ نامہ بلوچی دو ایسے رسالے تھے جو مسلسل شائع ہو رہے تھے اور اِن ہی کے فیض سے بلوچی فکشن بین الاقوامی ادب کے نمایاں رجحانات سے روشناس ہو رہا تھا:

_ "بلوچی فکشن کے اس ابتدائی دور میں تراجم کی رفتار اتنی تیز نہیں تھی۔ اس کی سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ اس دور میں بلوچی ادب میں رسائل وجرائد کی روایت اتنی مستحکم نہیں ہے۔ اس وقت صرف ماہ نامہ اومان اور ماہ نامہ بلوچی دو ایسے رسالے ہیں جو مسلسل شائع ہو رہے ہیں۔ ۱۹۵۲ سے لے کر ۱۹۶۰ء تک صرف چھبیس (۲۶) افسانوں کا بلوچی میں ترجمہ ہوا جو اِن دو رسالوں میں شائع ہوئے۔"[۳]

ان ابتدائی برسوں کے دوران جن افسانوں کا بلوچی میں ترجمہ ہوا اُن میں سے کچھ یوں ہیں۔

افسانہ	افسانہ نگار	مترجم
پشومانیں جنین	گورکی	ع۔ص۔امیری
سرگردانیں ساھگ	رابندر ناتھ ٹیگور	ع۔ص۔امیری
لیپ	چیخوف	عبداللہ جان جمال دینی
مصیبت	اوہنری	اکبر بارکزئی
سیاھیں روچ	کرشن چندر	امان اللہ جمال دینی

تاہم بلوچی افسانوں کے اردو تراجم کا سلسلہ قدرے تاخیر سے شروع ہوا۔ ممتاز محقق ڈاکٹر انعام الحق کوثر کے مرتب کردہ اشاریے بلوچی سے اردو تراجم کے مطابق بلوچی کا سب سے پہلا افسانہ جو اردو میں ترجمہ ہوا وہ امام بخش بلوچ کا دو استار تھا جسے خود مصنف نے دو ستارے کے عنوان سے ترجمہ کیا۔ یہ افسانہ ۱۹۶۴ء میں ماہ نامہ بلوچی دنیا ملتان میں شائع ہوا۔ اسی طرح ماہ نامہ بلوچی دنیا ملتان کے نومبر دسمبر ۱۹۶۴ء کے شمارے میں امام بخش بلوچ نے اپنے ایک اور افسانے وشیں واب کو حسین خواب کے عنوان سے اردو میں ترجمہ کیا۔ تاہم اس پر افسانے سے زیادہ تمثیل کا گمان ہوتا ہے جسے مصنف نے لفظی ترجمے کے ذریعے اردو کا جامہ پہنایا ہے:

> من منزل منزل داران دیم پہ وتی منزل ئِ گام جنان اتاں منی منزل منی زندئِ وش رنگ شکلیں واب، منی زندئِ اولی واھگ ئُ ھُب سبز ئُ آبادیں جاگہ ئُ ھند سرسبز ئُ شاداباین کوچگ ئُ ڈگار ئُ برزئُ دور شریں سرمگیں کوہ ئُ ھسار آھانی چاریں نیمگ سبزیں درچکانی کتار ئُ وت رُستگیں کاھانی گالی۔[۴]

امام بخش نے اس پیراگراف کو ہو بہو اردو میں ترجمہ کیا:

> میں منزل منزل رکتا ہوا اپنی منزل کی طرف قدم بڑھاتا رہا تھا۔ میری منزل! میری زندگی کے حسین اور خوب صورت خواب، میرے من کی اولین چاہت و احساس، سبز اور آباد جگہیں اور علاقے، سرسبز و شاداب وادی اور کھیت ____ اونچے اور پھیلے ہوئے سرمگیں پہاڑ اور چٹانیں۔ اُن کے چاروں طرف سبز درختوں کی قطار اور خودرو گھاس کے غالیچے۔[۵]

تاہم ترجمے کا یہ سلسلہ ایک انفرادی کوشش سے آگے نہ بڑھ پایا اور آئندہ دو دہائیوں تک بلوچی افسانہ مترجمین کا منتظر رہا جو اسے ترجمے کے وسیلے سے اردو کے قارئین تک پہنچا کر اسے قومی ادبی دھارے میں شامل کرائیں۔

۱۹۸۰ء کی دہائی میں پاکستان اکادمی ادبیات کے سہ ماہی مُجلّہ ادبیات، اور کوئٹہ سے ماہ نامہ نوکیں دور کے اجراء سے بلوچی افسانوں کے اردو تراجم کے سنہرے دور کا آغاز ہوا ہے۔ اس دور میں جن نمایاں بلوچی افسانوں کا اردو میں ترجمہ ہوا اِن میں نسخہ از غنی پرواز ایک ستارہ ٹوٹا از نعمت گچکی، قحط سالی از عبدالغفار گچکی، آواز از غنی طارق تشنہ کام از منیر عیسیٰ آتش بارسائے از مراد ساحر، بلی اور بوڑھا از منیر بادینی، انعام از ایم بیگ غریب باسی از رزاق نادر وغیرہ شامل ہیں۔

غنی پرواز بلوچی فکشن کے اہم ترین ناموں میں سے ایک ہیں۔ وہ نہ صرف اپنے ہم عصروں بلکہ بلوچی افسانوی ادب میں ایک منفرد مقام و مرتبے کے حامل ہیں۔ وہ گزشتہ نصف دہائی سے مسلسل لکھتے آرہے ہیں۔ انھوں نے غالباً سب سے زیادہ افسانے لکھے ہیں۔ نہ صرف عددی اعتبار سے ان کو برتری حاصل ہے بلکہ ان کے ہاں موضوعات اور تکنیک کا بھی تنوع نظر آتا ہے۔ انھوں نے اپنے افسانوں میں سماجی ناہمواریوں کے خلاف بڑے موثر پیرائے میں احتجاج کیا ہے۔ وہ ایک ایسے معاشرے کے خواہاں ہیں جہاں امن و اخوت، انصاف و رواداری کی فراوانی ہو اور یہ معاشرہ منافقت، ریاکاری اور بدعنوانی سے پاک ہو۔ اب تک اُن کے چھے افسانوی مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔

غنی پرواز کو یہ اعزاز بھی حاصل ہے کہ ان کے سب سے زیادہ افسانے اردو میں ترجمہ ہوئے ہیں۔ ان افسانوں میں تھوڑا ساپانی (ترجمہ از، مصنف) مرے ہوئے شخص کی کھلی ہوئی آنکھیں (ترجمہ از: محسن بالاچ) گرکاب کا کنواں (ترجمہ از: رؤف راز) بے چارہ (ترجمہ از: حنیف شریف) اور دس دس کے چارنوٹ (ترجمہ از: افضل مراد) قابل ذکر ہیں۔

اب تک غنی پرواز کے افسانوں کے اردو تراجم کے دو مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔ پہلا مجموعہ تھوڑا سا پانی ۲۰۰۵ء میں بلوچستان اکیڈمی تربت کی جانب سے شائع ہوا۔ اس مجموعے میں تیئس افسانے شامل ہیں جنھیں مصنف سمیت دیگر مترجمین نے موثر پیرائے میں بلوچی کا روپ دیا ہے۔ ان کے افسانوں کا دوسرا مجموعہ جنگل ۲۰۱۵ء میں جمشید پبلشر کیچ کی جانب سے شائع ہوا۔

منیر احمد بادینی اپنے فلسفیانہ اور نفسیاتی موضوعات کی وجہ سے بلوچی ادب میں ایک الگ مقام بنا چکے ہیں۔ انھوں نے اپنے تخلیقی سفر کا آغاز افسانہ نگار کی حیثیت سے کیا لیکن بعد میں ناول نویسی کی طرف متوجہ ہوئے اور اب تک ڈیڑھ سو کے قریب ناول لکھ چکے ہیں۔ ان کا ناولٹ بلے کہ ماہ بہ کپیت کو کے بی فراق نے چاند کو ڈھلنے دو کے عنوان سے اردو کا جامہ پہنایا ہے جب کہ قاسم بلوچ نے کے ناول شال ءِ گلیں بازار کو شال کی مہکتی فضاؤں کے عنوان سے اردو میں ترجمہ کیا ہے۔

منیر احمد بادینی کے افسانے فرد کے داخلی انتشار کا بیانیہ ہیں۔ ان کے کردار اکثر ایسے افراد ہیں جو اندرونی طور پر شکست وریخت کا شکار ہو کر باطنی اور وجودی کرب سے گزر رہے ہوتے ہیں:

> منیر احمد بادینی اپنے عہد کے دیگر افسانہ نگاروں سے منفرد نظر آتے ہیں۔ ان کے کردار داخلی طور پر شکست وریخت کا شکار ہیں، وہ فلسفی کی طرح اپنی آنکھیں کھول کر معاشرے کو دیکھ کر مبہوت رہ جاتے ہیں اور دوبارہ آنکھیں بند کر کے زندگی کی لامعنویت کو معنی عطا کرنے کی سعی کرتے ہیں۔[6]

منیر احمد بادینی کے متعدد افسانوں کا اردو میں ترجمہ ہو چکا ہے جن میں بلی اور بوڑھا (مترجم عبید شاد) میرے بیٹے کا کلاس فیلو (مترجم شرف شاد) یخ میں تپ (مترجم کے بی فراق) لفافہ (مترجم عبید شاد) آخری سسکی (مترجم رؤف راز) وغیرہ شامل ہیں۔ ان کے افسانوں کے اردو تراجم کا مجموعہ صدیوں لمبی رات سچکان پبلشر گوادر کی جانب سے شائع ہو چکا ہے جسے شرف شاد نے اردو کا جامہ پہنایا ہے۔

ڈاکٹر نعمت اللہ گچکی اپنے سادہ بیانیہ اور رواں اسلوب کی وجہ سے بلوچی ادب میں ایک نمایاں مقام رکھتے ہیں۔ ان کے افسانے اکثر نچلے طبقے کے مسائل کی عکاسی کرتے ہیں۔ زندگی کے بنیادی مسائل سے محروم یہ طبقہ اپنی جملہ بے سروسامانیوں کے ساتھ ان کے افسانوں میں جگہ جگہ دکھائی دیتا ہے:

> پسے ہوئے طبقے کے مسائل کی عکاسی کرتے ہوئے نعمت اللہ گچکی کوئی احتجاج نہیں کرتے، چیختے چلاتے نہیں بلکہ اپنے اسلوب کے ذریعے ہمیں غور وفکر کی دعوت دیتے ہیں کہ اس طبقے کی محرومیوں کا ذمہ دار کون ہے۔[7]

نعمت اللہ گچکی کے جن افسانوں کا اردو میں ترجمہ ہوا ہے ان میں ندی کا بہاؤ (مترجم کے بی فراق) کیا یہی زندگی ہے؟ (مترجم غوث بخش صابر) ایک ستارہ ٹوٹا (مترجم پیر محمد زبیرانی) وغیرہ شامل ہیں۔

گوہر ملک بلوچ خواتین لکھاریوں میں ممتاز مقام رکھتی ہیں۔ ان کے والد میر گل خان نصیر کا شمار جدید بلوچی ادب کے بانیوں میں ہوتا ہے۔ ایک قادر الکلام شاعر ہونے کے ساتھ ساتھ وہ بیک وقت ایک مورخ، محقق، مترجم اور صحافی بھی تھے۔ اپنے والد کی طرح گوہر ملک بھی متنوع شخصیت کی حامل خاتون تھیں۔ افسانہ نویسی میں ان کا ایک منفرد اور اچھوتا انداز ہے۔ اپنے افسانوں میں انھوں نے قبائلی معاشرے کی ستم رسیدہ عورت کے مسائل کو موثر انداز میں بیان کیا ہے:

> گوہر ملک کے افسانوں میں بلوچ معاشرے کے خدوخال نمایاں طور پر نظر آتے ہیں اِن کو اپنے فن پر مکمل دسترس حاصل تھی خوبصورت پلاٹ، زبان و بیان کی خوبصورتی، جیتے جاگتے کردار، خوبصورت منظر کشی، تکنیک پر ان کی گرفت ان کے افسانوں کو ادب کے بے مثال سانچے میں ڈھال دیتی ہے۔[8]

گوہر ملک کے چند افسانوں کا اردو میں ترجمہ ہوا ہے جن میں بلوچ نے مجھے دھکا دیا (مترجم شاہ محمد مری) بڑھیا کی تنہائی (مترجم شاہ محمد مری) اور بانجھ (مترجم شاہ محمد مری) شامل ہیں۔ یہ تراجم شاہ محمد مری کے مرتب کردہ مجموعہ بلوچ نے مجھے دھکا دیا میں شامل ہیں۔ اس کتاب میں گوہر ملک تخلیقات کو مرتب کیا گیا ہے۔ شاہ محمد مری کے علاوہ افضل مراد نے بھی گوہر ملک کے افسانوں کو اردو کا جامہ پہنایا ہے ان میں اور بلوچ نے مجھے دھکا دیا اور دادی کیوں تنہا ہے؟ قابلِ ذکر ہیں۔

گوہر ملک کا افسانہ بلوچ نے مجھے دھکا دیا ادبی حلقوں میں کافی مقبول ہوا۔ یہ طنزیہ افسانہ انھوں نے ۱۹۹۸ء میں چاغی کے مقام پر پاکستان کے ایٹمی دھماکوں کی تباہ کاریوں کے پس منظر لکھا ہے اور یہ افسانہ ایٹمی دھماکوں کی تباہ کاریوں سے متعلق ضمیر جعفری کی مرتب کردہ کتاب زمین کا نوحہ میں بھی شامل ہے۔

اے آر داد ایک کثیر الجہت تخلیق کار ہیں۔ انھیں بیک وقت ادب کی متعدد اصناف پر یکساں دسترس حاصل ہے۔ ان کا شمار ان تخلیق کاروں میں ہوتا ہے جنھوں نے جدید مغربی ادبی رجحانات کو بلوچی ادب میں متعارف کرایا ہے۔ وہ افسانہ نویسی کے علاوہ شاعری، تنقید اور ترجمہ نگاری پر یکساں عبور رکھتے ہیں۔ ان کے افسانوں میں علامتی اور تجریدی رنگ نمایاں نظر آتا ہے۔ اُن کے اکثر افسانوں میں اپنے ماضی میں تہذیب سے بچھڑنے کا دکھ نمایاں نظر آتا ہے۔ اُن کے متعدد افسانوں کا اردو میں ترجمہ ہو چکا ہے اِن میں دھوبی کی چاردیواری (مترجم رؤف راز) دریچے میں چاند (مترجم واحد بزدار) جنگل کہاں ہے؟ (مترجم محسن بالاچ) اور بے نوائی (مترجم واحد بزدار) قابلِ ذکر ہیں۔

ناگمان جدید بلوچی افسانے کے ایک معتبر نام ہیں ان کا صرف ایک افسانوی مجموعہ دار ءِ اسپ (کاٹھ کا گھوڑا) شائع ہو چکا ہے۔ اُن کے اکثر افسانوں کا موضوع انسانی رشتے اور ان کی نوعیت ہیں۔ اُن کے دو افسانوں شاندار عمارت اور اسٹیکر کا شرف شاد نے اردو میں ترجمہ کیا ہے جب کہ ان کے افسانے گوات کو کے۔ بی فراق نے ہوا کے عنوان سے اردو کا روپ دیا ہے۔

صبا دشتیاری کا شمار جدید بلوچی ادب کے محسنوں میں ہوتا ہے۔ وہ بیک وقت ایک محقق، شاعر، مترجم، تنقید نگار اور افسانہ نگار تھے۔ انھوں نے معاشرتی ناہمواریوں کو اپنے افسانوں کا موضوع بنایا ہے۔ ان کی افسانہ نویسی کا ایک امتیازی وصف شہری زندگی بالخصوص کراچی میں بسنے والے بلوچوں کی زندگی کے المیوں کو بیان کرنا ہے۔ اُن کے افسانے سوکھے پتوں کی سنگیت کو مہجور بدر نے اردو میں ترجمہ کیا ہے۔ جب کہ افضل مراد نے ان کے افسانے چہ کجا کائے؟ کو کہاں سے آئے ہو کے عنوان سے اردو کا جامہ پہنایا ہے۔

ان کے علاہ کئی اور بلوچی افسانوں کا اردو میں ترجمہ ہوا ہے جو وقتاً فوقتاً مختلف رسائل وجرائد میں شائع ہوتے رہے ہیں اِن میں سے کچھ حسبِ ذیل ہیں۔

افسانہ	مصنف	مترجم
لاعلاج	عباس علی زعیمی	شاہ محمد مری
محشر	غوث بہار	غنی پرواز
آوارہ کہانی بولے	حنیف شریف	غوث بخش صابر
آواز	غنی طارق	پیر محمد زبیرانی
چابیاں	آصف شفیق	آصف شفیق
کرسٹل	یاسمین مری	یاسمین مری
میں پلاسٹک کی بنی پتنگ ہوں	حنیف شریف	ایف۔جے۔فیضی
ہائے غریبی	منظور بلوچ	منظور بلوچ
اکیسویں صدی کا طلب	غنی طارق	ڈاکٹر علی دوست
مظلوم	حفیظ حسن آبادی	عبدالرؤف
پاگل	غنی طارق	غنی طارق

بہت سے بلوچی افسانے ایسے بھی ہیں جنھیں ایک سے زائد مترجم نے اردو میں ترجمہ کیا ہے۔ یہ ترجمے متن پر مترجمین کی گرفت، زبان پر مہارت اور تراجم کی تکنیک کے مختلف انداز کی عکاسی کرتے ہیں۔ ہر مترجم پہلے ایک قاری ہے اور ہر قاری کی جانب سے متن کی تفہیم کا اپنا ایک الگ اور منفرد انداز ہوتا ہے۔ لہٰذا ان تراجم میں ہمیں بعض چیزیں یکساں اور بعض الگ نظر آتی ہیں۔

منیر احمد بادینی کی کہانی پشی ءُ پیر کو عبید شاد نے بوڑھا اور بلی کے عنوان سے ترجمہ کیا ہے جب کہ شرف شاد نے اسے بلی اور بوڑھا کے عنوان سے اردو میں ترجمہ کیا۔ یہ فرق صرف عنوانات میں نہیں بلکہ متن میں بھی جابجا نظر آتا ہے۔

گوہر ملک کے نمائندہ افسانے بلوچ ءَ من ءَ تیلانک دات کو شاہ محمد مری نے بلوچ نے مجھے دھکا دیا کے عنوان سے ترجمہ کیا جب کہ اسی افسانے کو افضل مراد نے اور بلوچ نے مجھے دھکا دیا کے عنوان سے اردو میں منتقل کیا۔ دونوں تراجم میں زبان وبیان کا فرق نمایاں نظر آتا ہے۔

اِسی طرح غنی پرواز نے اپنے افسانے بس چار دہی نوٹ کو دس دس کے صرف چارنوٹ کے عنوان سے اردو میں منتقل کیا ہے۔ اِسی افسانے کو عین اسی عنوان کے تحت افضل مراد نے اردو کے قالب میں ڈھالا ہے۔ تاہم دونوں کے تراجم اور بیانیہ میں فرق نمایاں نظر آتا ہے۔

اس مختصر جائزے سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ بلوچی ادب میں افسانوں کے اردو تراجم کی ایک مضبوط اور مستحکم روایت موجود ہے جس نے بلوچی افسانہ کو قومی ادبی دھارے میں شامل کرانے میں کلیدی کردار ادا کیا۔

حوالہ جات:

۱۔ ڈاکٹر سیمی نغمانہ،۲۰۱۶ء،بلوچستان میں ابلاغ آغاز و ارتقاء،اسلام آباد،مقتدرہ قومی زبان،ص،۸۳،۸۴

۲۔ ارشاد عالم،۲۰۱۵ء،زعفران ئ پل، گوادر،سید ہاشمی اکیڈمی، ص،۱۲

۳۔ یاسمین حلیم،بلوچی ئ َرجتگیں گدارانی پٹ ئ ُپولی وانشت،مقالہ برائے ایم،فل غیر مطبوعہ،ص،۴۲

۴۔ امام بخش بلوچ،۱۹۶۴ء،وشیں واب، مشمولہ،ماہ نامہ بلوچی دنیا،ملتان،ص۵۰

۵۔ ایضاً

۶۔ اے آرداد،۲۰۰۸ء، گپ روان کنت،بلوچی اکیڈمی، کوئٹہ، ص،۱۰

۷۔ سحر احمد،مارچ۲۰۱۷ء،ماھتاک بلوچی، کوئٹہ، ص۲۵

۸۔ ڈاکٹر علی دوست،۲۰۰۶ء، مشمولہ،بلوچ نے مجھے دھکا دیا،سنگت اکیڈمی آف سائنسز،ص۱۱

Abstract

This article explains when and how translation began in the Balochi language. Religious texts were the first to be translated into the Balochi language. Balochi translation of religious texts came into being in 1876 from Maktab-e Darkhani in which the holy Quran and other Islamic texts were translated into Balochi and Brahavi languages to counterbalance the attempts of the Christian missionaries who were then active to influence the people of Balochistan. The literary translation in Balochi language started in 1950 when a monthly Omaan, edited by Maulana Kher Muhammad Nadvi, contributed a lot. Monthly Balochi paved the way for contributing fiction in Balochi language. Monthly Omaan and Balochi published 26 Balochi translations of short stories during mid of the twentieth century. Dawastaar was the first Balochi short story translated in Urdu as Do Sittare by the writer himself. In 1980, a quarterly Adabiat and a monthly Nokin daur contributed remarkably for translating Balochi short stories into Urdu.

Keywords: Translation in Balochi language, Omaan, Balochi, Nokin daur